اور اُدھر ہڑتال ہوئی۔ مزدوری میں دھیلے کی کمی بھی منظور نہ تھی۔ جب اس مہنگی کے دنوں میں ایک دھیلا بھی اجرت نہ بڑھی تو اب دہ گھٹانے میں کیوں ساتھ دے؟ مرزا خورشید مزدور سبھا کے پریسیڈنٹ اور پنڈت اونکارناتھ ایڈیٹر "بجلی" اس کے سکریٹری تھے۔ دونوں ایسی ہڑتال کرانے پر تلے ہوئے تھے کہ مل کے مالکوں کو کچھ دن یاد رہے۔ مزدوروں کو بھی ہڑتال سے نقصان پہنچے گا حتیٰ کہ ہزاروں آدمیوں کو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے اس پہلو پر ان کی نگاہ بالکل نہ تھی۔ گوبر ہڑتالیوں میں سب سے آگے تھا۔ اکھڑ سبھاؤ کا تھا ہی، للکارنے بھر کی ضرورت تھی، پھر تو وہ مارنے مرنے سے نہ ڈرتا تھا۔ ایک دن جھنیا نے اسے جی کڑا کر کے سمجھایا بھی کہ تم بال بچے والے آدمی ہو، تمہارا اس طرح آگ میں کود نا اچھا نہیں، مگر گوبر بگڑ اٹھا: "تو کون ہوتی ہے میرے بیچ میں بولنے والی؟ میں تجھ سے صلاح نہیں پوچھتا۔" بات بڑھ گئی اور گوبر نے جھنیا کو خوب پیٹا۔ چوہیا نے آکر جھنیا کو چھڑایا اور گوبر کو ڈانٹنے لگی۔ گوبر کے سر پر شیطان سوار تھا۔ سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر بولا: "تم میرے گھر میں مت آیا کرو چوہیا، تمہارے آنے کا کچھ کام نہیں۔"

چوہیا نے طنز سے کہا: "تمہارے گھر میں نہ آؤں گی تو میری روٹیاں کیسے چلیں گی؟ یہیں سے مانگ مانگ کر لے جاتی ہوں۔ تب تو اگرم ہوتا ہے۔ میں نہ ہوتی لالا، تو یہ بی بی آج تمہاری لائیں کھانے کے لئے نہ بیٹھی ہوتی۔"

گوبر گونستان کر بولا: "میں نے کہہ دیا کہ میرے گھر میں نہ آیا کرو تم ہی نے اس چڑیل کا مجاج آسمان پر چڑھا دیا ہے۔"

چوہیا وہیں جمی ہوئی بے خوف کھڑی رہی "اچھا اب چپ رہنا گوبر بیچاری ادھ مری عورت کو مار کر تم نے کوئی بڑی بہادری کا کام نہیں کیا ہے۔ تم اس کے لئے کیا کرتے ہو کہ تمہاری مار سہے؟ ایک روٹی کھلا دیتے ہو اسی لئے؟ اپنا بھاگ سراہو کہ ایسی گئو عورت پا گئے ہو۔ دوسری ہوتی تو تمہارے منہ پر جھاڑو مار کر نکل گئی ہوتی"

محلے کے لوگ جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے گوبر پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہی لوگ جو اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو روز پیٹتے تھے اس وقت رحم و انصاف کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ چوہیا اور شیر ہو گئی اور فریاد کرنے لگی "داڑھی جار کہتا ہے کہ میرے گھر نہ آیا کرو۔ بی بی بچہ رکھنے چلا ہے، پر یہ نہیں جانتا کہ بی بی بچوں کا پالنا بڑے گردے کا کام ہے۔ اس سے پوچھو میں نہ ہوتی تو آج یہ بچہ جو بچھڑے کی طرح کلیلیں کر رہا ہے، کہاں ہوتا؟ عورت کو مار کر جوانی دکھاتا ہے۔ میں نہ ہوئی تیری بی بی، نہیں تو یہی جوتی اٹھا کر تیرے منہ پر تڑاتڑ جماتی اور کوٹھری میں ڈھکیل کر باہر سے کنڈی بند کر دیتی۔ دانے دانے کو ترس جاتی"

گوبر جھلایا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ چوہیا مرد ہوتی تو مزا چکھا دیتا۔ عورت کے منہ کیا لگے؟

مل میں بجلی کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ مزدور "بجلی" کے پرچے جیب میں لئے پھرتے اور ذرا بھی موقع پاتے تو دو تین مزدور ملکر اسے پڑھنے لگتے۔ اخبار کی بکری خوب بڑھ رہی تھی۔ مزدوروں کے لیڈر "بجلی" کے کارخانے میں آدھی رات تک بیٹھے ہڑتال کی تجویزیں سوچا کرتے اور صبح ہوتے جب اخبار میں یہ خبر جلی حروف میں نکلتی تو پبلک ٹوٹ پڑتی

اور اخبار کی کاپیاں دوگنے تگنے قیمت پر بک جائیں۔ ادھر کمپنی کے ڈائرکٹر بھی اپنی گھات میں بیٹھے تھے۔ ہڑتال ہوجانے ہی میں ان کا فائدہ تھا۔ آدمیوں کی کمی تو ہے نہیں۔ بے کاری بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی نصف اُجرت پر ویسے ہی آدمی آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مال کی تیاری میں ایک دم آدھی بچت ہوجائیگی دس پانچ دن کام کا حرج ہوگا، کچھ پرواہ نہیں آخر یہ طے ہوگیا کہ اجرت میں کمی کا اعلان کردیا جائے۔ دن اور وقت مقرر کردیا گیا۔ پولیس کو اطلاع دی دی گئی۔ مزدوروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنی گھات میں تھے۔ اسی وقت ہڑتال کرنا چاہتے تھے۔ جب گودام میں بہت تھوڑا مال رہ جائے اور مانگ کی زیادتی ہو۔

یکایک ایک روز جب مزدور شام کو چھٹی پاکر جانے لگے تو ڈائرکٹروں کا اعلان سنادیا گیا۔ اسی وقت پولیس آگئی۔ مزدوروں کو اپنی مرضی کیخلاف اسی وقت ہڑتال کرنی پڑی جب گودام میں اتنا مال بھرا ہوا تھا کہ بہت زیادہ مانگ ہونے پر بھی چھ مہینے کے پہلے نہ اٹھ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے یہ خبر سنی تو مسکرائے جیسے کوئی ہوشیار جنرل اپنے دشمن کے جنگی کمال پر خوش ہوگیا ہو۔ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد بولے "اچھی بات ہے۔ اگر ڈائرکٹروں کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ حالات ان کے موافق ہیں، لیکن ہمیں بھی حق و انصاف پر بھروسہ ہے۔ وہ لوگ نئے آدمی رکھ کر اپنا کام چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ انھیں ایک بھی نیا آدمی نہ ملے، یہی ہماری فتح ہوگی۔"

"بجلی" کے دفتر میں اسی وقت خطرے کی میٹنگ ہوئی۔ کارکن کمیٹی بنائی گئی، عہدے داروں کا انتخاب ہوا اور آٹھ بجے رات کو مزدوروں کا

لمبا جلوس نکلا۔ دس بجے رات کو اگلے دن کا سارا پروگرام طے کیا گیا اور یہ تاکید کر دی گئی کہ کسی طرح کا شر و فساد نہ ہونے پائے۔

مگر ساری کوشش بیکار ہوئی۔ ہڑتالیوں نے نئے مزدوروں کی کثیر تعداد مل کے پھاٹک پر کھڑی دیکھی تو ان کی مفسدانہ رغبت قابو سے باہر ہو گئی سوچا تھا کہ سو سو پچاس پچاس آدمی روزانہ بھرتی کے لئے آئیں گے تو انھیں سمجھا بجھا کر یا دھمکا کر بھگا دیں گے۔ ہڑتالیوں کی تعداد دیکھ کر آنے والے مزدور آپ ہی ڈر جائیں گے۔ مگر یہاں تو نقشہ ہی دگرگوں تھا۔ اگر یہ کل آدمی بھرتی ہو گئے تو ہڑتالیوں کے لئے سمجھوتے کی کوئی امید ہی نہ تھی۔ طے ہوا کہ نئے آدمیوں کو مل میں جانے ہی نہ دیا جائے۔ طاقت کے استعمال کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ نیا گروہ بھی مرنے مارنے پر تیار تھا۔ ان میں زیادہ تر بھوکے تھے جو اس موقع کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ بھوکوں مر جانے یا اپنے بال بچوں کو بھوکوں مرتے دیکھنے سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ حالات حاضرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مریں۔ دونوں جماعتوں میں فوجداری ہو گئی۔ "بجلی" کے ایڈیٹر تو بھاگ کھڑے ہوئے ہاں، بیچارے مرزا جی پٹ گئے اور ان کے بچانے میں گوبر بھی بری طرح زخمی ہوا۔ مرزا پہلوان آدمی تھے اور منجھے ہوئے پھینکیٹ، اپنے اوپر کوئی گہرا وار نہ پڑنے دیا۔ گوبر دہقانی تھا، پورا لٹھ مار مگر اپنی حفاظت کرنا نہ جانتا تھا جو لڑائی میں سب سے زیادہ اہم بات ہے اس کے ایک ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، سر پھٹ گیا۔ اور آخر کار وہیں ڈھیر ہو گیا کندھوں پر بے شمار لاٹھیاں پڑی تھیں جس سے اس کا ایک ایک عضو چور چور ہو گیا تھا۔ ہڑتالیوں نے اسے گرتے دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے صرف دس بارہ جیالے ہوئے آدمی مرزا کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ نئے آدمی فتح کا

جھنڈا اڑاتے ہوئے مل میں داخل ہوئے اور ہارے ہوئے ہڑتالی اپنے زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر اسپتال پہنچانے لگے۔ مگر اسپتال میں اتنے آدمیوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ مرزا توے لئے گئے، گوبر کی مرہم پٹی کر کے اس کے گھر پہنچا دیا۔

جھنیا نے گوبر کا وہ بے جان سا جسم دیکھا تو اس کی نسائیت بیدار ہو گئی اب تک اس نے اسے طاقت کی شکل میں دیکھا تھا جو آپس پر حکومت کرتا تھا اور اسے ڈانٹتا مارتا تھا۔ آج وہ ناکارا، بے کس اور قابل رحم تھا۔ جھنیا نے کھاٹ پر جھک کر آنسو بھری آنکھوں سے گوبر کو دیکھا اور گھر کی حالت کا خیال کر کے اسے گوبر پر رشک آمیز غصہ آیا۔ گوبر جانتا تھا کہ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں سے ایک پیسہ ملنے کی امید نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی، اس کے بار بار سمجھانے پر بھی، اس نے یہ آفت اپنے اوپر لی۔ اس نے کتنی بار کہا تھا کہ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو، آگ لگانے والے آگ لگا کر الگ ہو جائیں گے اور جائے گی غریبوں کے سر، لیکن وہ کب اس کی سننے والا تھا وہ تو اس کی بیرن تھی۔ دوست تو وہ لوگ تھے جو مزے سے موٹروں میں گھوم رہے تھے۔ اس غصے میں ایک طرح کا اطمینان تھا جیسے ہم ان بچوں کو کرسی سے گرتے دیکھ کر جو بار بار منع کرنے پر بھی کھڑے ہونے سے باز نہ آتے، چلا اٹھتے ہیں "اچھا ہوا، بہت اچھا تمہارا سر کیوں نہ پھٹ گیا۔"

لیکن ایک ہی لمحے میں گوبر کا چلانا سن کر اس کے سارے ہوش و حواس ٹھکانے آ گئے۔ درد و تکلیف میں ڈوبے ہوئے اس کے منہ سے یہ لفظ نکلے "ہائے ہائے! سارا بدن بھُرکس ہو گیا۔ سبوں کو تنک بھی دیا نہ آئی۔"

وہ اسی طرح بڑی دیر تک گوبر کا منہ دیکھتی رہی۔ وہ بجھتی ہوئی امید سے زندگی کی کوئی علامت پا لینا چاہتی تھی اور ہر لمحہ اس کا صبر و استقلال غروب ہونے والے سورج کی طرح ڈوبتا جاتا تھا اور مستقبل کی تاریکی اسے اپنے اندر سمیٹے لیتی تھی۔

دفعتاً چوہیا نے پکارا "گوبر کا کیا حال ہے بہو؟ میں نے تو ابھی سنا دوکان سے دوڑی آئی ہوں"

جھنیا کے رُکے ہوئے آنسو ابل پڑے۔ کچھ بول نہ سکی۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے چوہیا کی طرف دیکھا۔

چوہیا نے گوبر کا منہ دیکھا، اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور تشفی کے لہجے میں بولے "یہ چار دن میں اچھے ہو جائیں گے۔ گھبراؤ مت۔ کسل ہوئی تیرا سہاگ بلوان تھا۔ کئی آدمی اسی دنگے میں مر گئے۔ گھر میں کچھ روپے پیسے ہیں؟"

جھنیا نے شرم سے سر ہلا دیا۔

"میں لائے دیتی ہوں، تھوڑا سا دودھ لا کر گرم کرلے"

جھنیا نے اس کے پیر پکڑ کر کہا "دیدی۔ تم ہی میری ماتا ہو۔ میرا دوسرا کوئی نہیں ہے"

جاڑوں کی اداس شام آج اور بھی اداس لگ رہی تھی۔ جھنیا نے چولھا جلایا اور دودھ ابالنے لگی۔

چوہیا برآمدے میں بچے کو لئے کھلا رہی تھی۔

دفعتاً جھنیا بھرے ہوئے گلے سے بولی "میں بڑی ابھاگن ہوں دیدی! میرے جی میں ایسا آرہا ہے جیسے میرے ہی کارن ان کی یہ گت

ہوئی ہے۔ جی کڑھتا ہے تب دل دکھی ہوتا ہی ہے۔ پھر گالیاں بھی نکلتی ہیں اور سراپ بھی نکلتا ہے۔ کون جانے میری گالیوں ....."

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں کے بہاؤ میں آواز بھی بہ گئی۔

چوہیا نے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیسی باتیں سوچتی ہے، بیٹی؟ یہ تیرے سیندور کا بھاگ ہے کہ بچ گئے مگر ہاں اتنا ہی کہ آپس میں لڑائی ہو تو منہ سے چاہے جتنا بک لے پر من میل نہ رکھے۔ بیچ اندر پڑا تو انکھوا نکلے بنا نہیں رہتا۔"

جھنیا نے تھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "اب میں کیا کہوں دیدی؟"

چوہیا نے ڈھارس دی "کچھ نہیں بیٹی۔ بھگوان کا نام لے، وہی گریبوں (غریبوں) کی رچھا (حفاظت کرتے ہیں۔"

اسی وقت گوبر نے آنکھیں کھولیں اور جھنیا کو سامنے دیکھ کر التجا کے انداز سے کمزور آواز میں بولا۔

"آج بہت چوٹ کھا گیا جھنیا! میں کسی سے کچھ نہیں بولا۔ سبوں نے ایک دم مجھے مارا۔ کہا سنا چھما کرنا! تجھے ستانا تھا۔ اسی کا یہ پھل ملا۔ تھوڑی دیر کا اور مہمان ہوں۔ اب نہ بچوں گا۔ درد کے مارے سارا بدن پھٹا جاتا ہے۔"

چوہیا نے اندر آکر کہا "چپ چاپ پڑے رہو، بولو، چالو نہیں، مروگے نہیں، اس کا میرا جمہ (ذمہ) ۔"

گوبر کے چہرے پر امید کی جھلک آگئی، بولا "سچ کہتی ہو، میں مروں گا نہیں۔"

"ہاں، نہیں مروگے۔ تمھیں ہوا کیا ہے؟ جرا (ذرا) سر میں چوٹ

آگئی ہے اور ہاتھ کی ہڈی اتر گئی ہے۔ ایسی چوٹیں مردوں کو بت ہی لگا کرتی ہیں ان سے کوئی مرتا نہیں۔"

"اب میں جھنیا کو کبھی نہ ماروں گا۔"

"ڈرتے ہو گے کہ کہیں جھنیا تمھیں نہ مارے۔"

"وہ مارے گی بھی تو نہ بولوں گا۔"

"اچھے ہونے پر بھول جاؤ گے۔"

"نہیں دیدی، کبھی نہ بھولوں گا۔"

گوبر اس وقت بچوں کی سی باتیں کیا کرتا۔ دس پانچ منٹ غافل پڑا رہتا۔ اس کا جی نہ جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا۔ کبھی دیکھتا کہ وہ ندی میں ڈوبا جا رہا ہے اور جھنیا اسے بچانے کے لئے ندی میں چلی آ رہی ہے کبھی دیکھتا کہ کوئی دیو اس کے سینے پر سوار ہے اور جھنیا کی شکل کی کوئی دیوی اسے بچا رہی ہے اور بار بار چونک کر پوچھتا "میں مروں گا تو نہیں، جھنیا؟"

تین دن اس کی یہی حالت رہی اور جھنیا نے رات کو جاگ کر اور دن کو پاس کھڑے رہ کر گویا موت کے منہ سے اسے بچایا۔ بچے کو چوہیا سنبھالے رہتی تھی۔ چوتھے دن جھنیا یکہ لائی اور سب نے گوبر کو اس پر لاد کر اسپتال پہنچایا۔ وہاں سے لوٹ کر گوبر کو معلوم ہوا کہ وہ اب بچ جائے گا اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "مجھے چھما کر دو جھنا!"

اب تین چار دن میں چوہیا کے تین چار روپے خرچ ہو گئے تھے اور اب جھنیا کو اس سے کچھ لینے میں تامل ہوتا تھا۔ وہ بھی کوئی مالدار تو تھی نہیں لکڑی کی بکری کے روپئے جھنیا کو دے دیتی تھی۔ آخر جھنیا نے کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی گوبر اچھا ہوتے مہینوں لگیں گے کھانے پینے کو بھی چاہیئے، دوا دارو

کو بھی چاہیئے۔ وہ کچھ کام کر کے کھانے بھر کو تو لے ہی آئے گی۔ بچپن سے اس نے گایوں کا پالنا اور گھاس چھیلنا سیکھا تھا۔ یہاں گائیں تو تھیں نہیں، ہاں وہ گھاس چھیلنے جاتے تھے اور آٹھ دس آنے کما لیتے تھے۔ وہ علی الصباح گوبر کا ہاتھ منہ دھلا کر اور بچے کو اسے سونپ کر گھاس چھیلنے چلی جاتی اور بھوکی پیاسی تیسرے پہر تک چھیلتی رہتی۔ پھر اسے منڈی میں لے جا کر بیچتی اور شام کو گھر آتی رات کو بھی وہ گوبر کی نیند سوتی اور گوبر کی نیند جاگتی۔ مگر اتنی سخت محنت کرنے پر بھی اس کا دل ایسا بشاش رہتا گویا جھولے پر بیٹھی گا رہی ہو۔ راستے بھر ہمراہی عورتوں مردوں سے ہنستی بولتی ہوئی چلی جاتی اور گھاس چھیلتے وقت بھی سب میں ویسی ہی باتیں ہوتی رہتیں نہ تقدیر کا شکوہ، نہ تباہی کا گلا۔ زندگی کی معنویت میں، یگانوں کے لئے زبردست سے زبردست ایثار میں، اور آزادانہ محنت میں جو خوشی ہے اس کی چمک اس کے ہر ہر عضو سے ظاہر تھی۔ بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر جیسے تالیاں بجا بجا کر خوش ہوتا ہے کچھ ویسی ہی خوشی وہ بھی محسوس کر رہی تھی، گویا اس کے دل میں خوشی کا کوئی چشمہ جاری ہو گیا ہو۔ اور جب دل بحال ہو تو پھر بھی کیوں ویسا نہ رہے؟ اسی ایک مہینے میں جیسے اس کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اس کے اعضاء میں اب سستی نہیں بلکہ تیزی ہے، لچک ہے اور نزاکت ہے۔ چہرے پر وہ زردی نہیں بلکہ خون کی گلابی رنگت ہے۔ اس کا شباب جو اس بند کوٹھری میں پڑے پڑے ذلت اور خانہ جنگی سے افسردہ ہو گیا تھا وہ گویا ہوا اور روشنی پا کر لہلہا اٹھا ہے۔ اب اسے کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ بچے کے ذرا سے رونے پر جو وہ جھنجلا اٹھا کرتی تھی اب گویا اس کی برداشت اور محبت کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

اس کے خلاف گوبر اچھا ہوتے جانے پر بھی کچھ اداس رہتا تھا جب

ہم اپنے عزیز پر ظلم کرتے ہیں اور جب مصیبت آپڑنے سے ہم میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ اس کی شدید تکلیف کو خود محسوس کرسکیں، تو اس سے ہمارا دل بیدار ہوجاتا ہے اور ہم اس بے جا سلوک کا کفارہ کرنے کے لئے تیار ہوجاتے۔ گوہر اسی کفارے کے لئے بے قرار ہورہا تھا۔ اب اس کی زندگی کا رویہ بالکل دوسرا ہوگا جس میں تلخی کی جگہ شیرینی ہوگی اور غرور کے بجائے انکسار اسے اب معلوم ہوا کہ خدمت کرنے کا موقع بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے اور اب وہ اسے کبھی نہ بھولے گا۔

مسٹر کھنا کو مزدوروں کی یہ ہڑتال بالکل بے جا معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ عوام کے ساتھ ملے رہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود کو عوام ہی کا آدمی سمجھتے تھے۔ سابق قومی تحریک میں انھوں نے بڑا حوصلہ دکھایا تھا۔ اس وقت ضلع کے خاص لیڈر تھے، دو بار جیل گئے تھے اور کئی ہزار کا نقصان اٹھایا تھا۔ اب بھی وہ مزدوروں کی شکایتیں سننے کے لئے تیار تھے۔ مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مل کے حصے داروں کے فائدے خیال قطعی چھوڑ دیں۔ اپنا سوار تھ چھوڑ دینے کو وہ تیار ہو سکتے تھے بشرطیکہ ان کی بلند خیالی سے مس ہو مگر حصے داروں کے اغراض کی حفاظت نہ کرنا، یہ تو ادھرم تھا یہ تو کاروبار ہے، کوئی سدابرت نہیں کہ سب کا سب مزدوروں ہی کو بانٹ دیا جائے۔ حصے داروں کو یہ یقین دلا کر روپئے لئے گئے تھے کہ اس کام میں پندرہ بیس روپئے سینکڑے کا منافع ہے اور اگر انھیں دس روپیہ سینکڑہ بھی نہ ملتے تو وہ ڈائرکٹر اور خصوصاً کھنا کو دھوکہ بازی تو سمجھیں گے۔ پھر اپنی تنخواہ وہ کیسے کم کر سکتے تھے؟ اور کمپنیوں کے دیکھتے انھوں نے اپنی تنخواہ بہت کم رکھی ہے صرف ایک ہزار روپئے ماہوار لیتے تھے۔ کچھ کمیشن بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اگر وہ اتنا لیتے تھے تو مل کے چلانے کا سارا انتظام بھی تو اُن ہی کے ذمے تھا۔ مزدور صرف ہاتھ سے کام کرتے ہیں، ڈائرکٹر اپنی عقل سے، اپنے علم سے اور اپنے اثر سے کام کرتا ہے۔ دونوں طاقتوں کی قیمت برابر تو نہیں ہو سکتی مزدوروں کو یہ سوچ کر کیوں نہیں صبر ہوتا کہ کساد بازاری کا وقت ہے۔ اور چاروں

طرف بیکاری پھیلی ہونے کے سبب آدمی سستے ہو گئے ہیں۔ انھیں تو ایک کی جگہ پون بھی ملے تو مطمئن رہنا چاہئے تھا۔ سچ پوچھو تو وہ مطمئن ہی ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو جاہل مطلق ہیں۔ شرارت تو ادنکار ناتھ اور مرزا خورشید کی ہے۔ یہی لوگ ان غریبوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچا رہے ہیں، صرف تھوڑی سے پیسے اور کچھ ناموری کے لالچ میں پڑ کر۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اس حرکت سے کتنے گھر تباہ ہو جائیں گے۔ ادنکار ناتھ کا اخبار نہیں چلنا تو کھنا کیا کریں؟ اور آج ان کے اخبار کے ایک لاکھ گاہک ہو جائیں جس سے انھیں پانچ لاکھ کا منافع ہونے لگے تو کیا وہ صرف اپنے گزر بسر کے لئے لے کر بقیہ رقم کام کرنے والوں کو تقسیم کر دیں گے؟ کہاں کی بات! اور یہ تیاگی مرزا بھی تو ایک دن لکھ پتی تھے اور ہزاروں مزدوران کے یہاں کام کرتے تھے، تو کیا وہ اپنی ضرورت بھر کے لئے لے کر بقیہ رقم مزدوروں کو بانٹ دیتے تھے؟ کیا وہ اسی ضرورت بھر کی قلیل رقم میں یورپین چھوکریوں کے ساتھ عیش و عشرت کرتے تھے، بڑے بڑے افسروں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے تھے، ہزاروں روپئے ماہوار کی شراب پی جاتے تھے اور ہر سال فرانس اور سوئیزرلینڈ کی سیر کرتے تھے؟ آج مزدوروں کی حالت پر ان کا کلیجہ پھٹتا ہے!

ان دونوں لیڈروں کی تو کھنا کو پروا نہ تھی ان کی نیت کی صفائی میں پورا شک تھا۔ نہ رائے صاحب ہی کی انھیں پرواہ تھی جو ہمیشہ کھنا کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے اور ان کی ہر بات کی تائید کر دیا کرتے تھے، اپنے شناساؤں میں صرف ایک ہی ایسا شخص تھا جس کی غیر جانبدارانہ رائے پر کھنا کو کامل اعتماد تھا اور وہ تھے ڈاکٹر مہتا۔ جب سے انھوں نے مالتی

سے اپنا تعلق بڑھانا شروع کیا تھا، کھنا کی نظروں میں ان کی عزت بہت کم ہوگئی تھی مالتی برسوں کھنا کے دل کی مالکہ رہ چکی تھی مگر اس کو انھوں نے ہمیشہ کھلونا ہی سمجھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کھلونا انھیں بہت پیارا تھا اور اس کے کھو جانے یا ٹوٹ جانے یا چھن جانے پر وہ روئے بھی تھے۔ مگر تھی وہ کھلونا ہی۔ انھیں کبھی مالتی پر بھروسا نہ ہوا وہ کبھی ان کے شوق باہری پوشاک میں سما کر ان کے دل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ اگر خود کھنا سے بیاہ کے لئے کہتی تو وہ منظور نہ کرتے اور کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیتے۔ کتنے ہی اور انسانوں کی طرح کھنا کی زندگی بھی دوزخ تھی۔ ایک طرف وہ تیاگ اور سیوا اور اُپکار کے پجاری تھے تو دوسری طرف خود غرضی، عیش پسندی اور اقتدار کے ان کا اصلی رُخ کون تھا، یہ کہنا مشکل ہے شاید ان کی روح کا اعلیٰ نصف خدمت اور ہمدردی کے اجزاء سے بنا ہوا تھا اور ادنیٰ نصف خود غرضی اور عیش پسندی سے مگر اس اعلیٰ اور ادنیٰ میں برابر مقابلہ ہوتا رہتا تھا اور ادنیٰ ہی اپنی زبردستی اور ہٹ کے سبب امن اور سکون سے بھرے ہوئے اعلیٰ پر غالب آجاتا تھا۔ ادنیٰ مالتی کی طرف جھکتا تھا تو اعلیٰ مہتا کی طرف، مگر وہ اب ادنیٰ میں شامل ہوگیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مہتا جیسا معیار پرست آدمی مالتی جیسی شوخ اور آرام پسند عورت پر کیسے فریفتہ ہوگیا۔ وہ بہت کوشش کرنے پر بھی مہتا کو نفس پرستیوں کا شکار نہ قرار دے سکتے تھے۔ اور کبھی کبھی انھیں یہ شک بھی ہونے لگتا تھا کہ مس مالتی کا کوئی ایسا دوسرا روپ بھی ہے جسے نہ تو وہ دیکھ سکے اور نہ جسے دیکھنے کے وہ اہل ہی تھے۔

موافق و مخالف، سب ہی پہلوؤں پر غور کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس حالت میں ان کو مہتا ہی سے واجبی ہدایت مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر مہتا کو کام کرنے کا نشہ تھا۔ آدھی رات کو سوتے تھے اور پھر رات رہے جاگ پڑتے تھے۔ کیسا ہی کام ہو اس کے لئے وہ کہیں نہ کہیں سے وقت نکال لیتے تھے۔ ہاکی کھیلنا ہو یا یونیورسٹی کے مباحثے میں حصہ لینا ہو، "گانوں سنگٹھن" ہو یا کسی شادی کا نیوتا سب ہی کاموں کے لئے ان کے دل میں شوق تھا اور ان کے پاس وقت تھا۔ وہ اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے اور کئی سال سے فلسفہ کی ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے جو اب ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک سائنس کا کھیل ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے باغیچے میں بیٹھے ہوئے پودوں پر برقی اثر کی آزمائش کر رہے تھے۔ انھوں نے حال میں ایک سائنس کی انجمن میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ فصلیں برقی طاقت سے بہت کم وقت میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے اور بے فصل کی چیزوں کی اپج بھی کی جا سکتی ہے آج کل صبح کے دو تین گھنٹے وہ ان ہی باتوں کی آزمائش میں صرف کرتے تھے۔

مسٹر کھنّا کی یہ باتیں سن کر انھوں نے شرفائی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا: "کیا یہ ضروری تھا کہ ٹیکس لگ جانے سے مزدوروں کی اجرت گھٹا دی جائے؟ آپ کو سرکار سے شکایت کرنی چاہیئے تھی۔ اگر سرکار نے نہیں سنا تو اس کی سزا مزدوروں کو کیوں دی جائے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ مزدوروں کو اتنی اجرت دی جاتی ہے کہ اس میں ایک چوتھائی کی کمی سے انھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی؟ آپ کے مزدور بلوں میں رہتے ہیں، گندے اور بدبودار بلوں میں، جہاں آپ ایک منٹ رہیں تو قے ہو جائے، جو کپڑے وہ پہنتے ہیں ان سے آپ اپنے جوتے بھی نہ صاف کریں گے۔ جو کھانا کھاتے ہیں وہ آپکا کتا بھی نہ کھائے گا۔ میں نے ان کی زندگی میں حصہ لیا ہے۔ آپ ان کی روٹیاں

چھین کر اپنے حصّے داروں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں....."

کھنّا نے بے صبری سے کہا "مگر ہمارے سب ہی حصّے دار تو امیر نہیں ہیں۔ کتنوں ہی نے اپنا سب کچھ اسی مل کی نذر کر دیا ہے اور اس کے نفع کے سوا ان کی زندگی کا کوئی سہارا نہیں ہے۔"

مہتا نے اس انداز سے جواب دیا گویا اس دلیل کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ بولے "جو آدمی کسی کاروبار میں حصّہ لیتا ہے وہ اتنا مفلس نہیں ہوتا کہ اس کے منافع ہی کو زندگی کا سہارا سمجھے۔ ہو سکتا ہے کہ نفع کم ملنے پر اسے اپنا ایک نوکر کم کر دینا پڑے یا اس کے مکھن اور پھلوں کا بل گھٹ جائے مگر وہ ننگا یا بھوکا نہ رہے گا۔ جو اپنی جان کھپاتے ہیں ان کا حق ان لوگوں سے زیادہ ہے جو صرف روپیہ لگاتے ہیں۔"

یہی بات پنڈت اونکار ناتھ نے کہی تھی، مرزا خورشید نے بھی یہی صلاح دی تھی، حتیٰ کہ گوبندی نے بھی مزدوروں ہی کی حمایت کی تھی۔ مگر کھنا نے ان لوگوں کے کہنے کا خیال نہ کیا تھا۔ مگر مہتا کے منہ سے ویسا ہی سُن کر وہ متاثر ہو گئے۔ اونکار ناتھ کو وہ مطلبی سمجھتے تھے، مرزا کو غیر ذمہ دار اور گوبندی کو ناقابل۔ مہتا کی بابت میں کردار مطالعہ اور اخلاق کی طاقت تھی۔

دفعتاً مہتا نے پوچھا۔ آپ نے اپنی اہلیہ سے بھی اس بارہ میں رائے لی؟"

کھنّا نے لجاتے ہوئے کہا "ہاں، پوچھا تھا۔"

"ان کی کیا رائے تھی؟"

"وہی جو آپ کی رائے ہے۔"

"مجھے یہی امید تھی۔ اور آپ اس قابلہ کو ناقابل سمجھتے ہیں!"

اسی وقت مالتی آپہنچی اور کھنا کو دیکھ کر بولی "اچھا، آپ موجود ہیں! میں نے مہتا جی کی آج دعوت کی ہے سب ہی چیزیں اپنے ہاتھوں تیار کی ہیں۔ آپ کو بھی نیوتا دیتی ہوں۔ گوبندی دیوی سے آپ کا یہ قصور معاف کرا دوں گی۔"

کھنا کو تعجب ہوا۔ اب مالتی اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے لگی ہے۔ مالتی جو خود کبھی اپنے جوتے نہ پہنتی تھی، جو خود کبھی بجلی کا بٹن تک نہ دباتی تھی عیش و آرام ہی جس کی زندگی تھی۔ مسکرا کر بولے "اگر آپ نے پکایا ہے تو ضرور کھاؤں گا۔ میں تو کبھی سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ آپ اس فن میں بھی ماہر ہیں۔"

مالتی نے بلا تامل کہا "انھوں نے مار مار کر حکیم بنا دیا ہے۔ ان کا حکم کیسے ٹال سکتی؟ مرد دیوتا ٹھہرے جو!"

کھنا نے اس طنز سے لطف اٹھاتے ہوئے اور مہتا کی طرف آنکھیں مارتے ہوئے کہا "مرد تو آپ کی نگاہوں میں اتنے آدر کی چیز نہ تھے۔"

مالتی شرمائی نہیں۔ اس اشارہ کا مطلب سمجھ کر جوش کے لہجے میں بولی "لیکن اب ہو گئے ہیں، اس لئے کہ میں نے مرد کا جو روپ اپنی جان پہچان والوں کے لئے دائرے میں دیکھا تھا اس سے یہ کہیں بہتر ہے۔ مردانا بہتر، اتنا نرم دل....."

مہتا نے مالتی کی طرف انکسار سے دیکھا اور کہا "نہیں مالتی، مجھ پر رحم کرو ورنہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔"

ان دنوں جو بھی مالتی سے ملتا تو وہ اس سے مہتا کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی، جیسے کوئی نو مرید اپنے نئے عقائد کا ڈھنڈورہ پیٹتا پھرے۔ پسند کا بھی اسے نہ رہتا اور بے چارے مہتا دل میں کٹ کر رہ جاتے۔ وہ

تلخ اور درشت تنقید کو بڑے شوق سے سنتے تھے لیکن اپنی تعریف سن کر گویا بے وقوف بن جاتے تھے اور منہ ذرا سا نکل آتا تھا۔ اور مالتی ان عورتوں میں نہ تھی جو اندر رہ سکے، وہ باہر ہی رہ سکتی تھی، پہلے بھی اب بھی، عمل میں اور خیال میں بھی دل میں کچھ رکھ چھوڑنا وہ نہ جانتی تھی۔ جس طرح ایک عمدہ ساڑی پاکر وہ پہننے کے لئے بے چین ہو جاتی تھی۔ اسی طرح دل میں کوئی اچھا خیال آئے تو وہ اسے ظاہر کئے بغیر کل نہ پاتی تھی۔

مالتی نے اور قریب جاکر اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر، گویا ان کی حفاظت کرتے ہوئے کہا "اچھا بھا گو نہیں، اب میں کچھ نہ کہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اپنی ہجو زیادہ پسند ہے تو وہی سنو" کھنا جی! یہ حضرت مجھ پر اپنی محبت کا جال ...."

شکر مل کی چمنی یہاں سے صاف نظر آتی تھی۔ کھنا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چمنی کھنا کی نیک نامی کے ستون کی طرح آسمان میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ کھنا کی آنکھوں میں غرور چمک اٹھا۔ اسی وقت انھیں مل کے دفتر میں جانا ہے۔ وہاں ڈائرکٹروں کی ایک فوری اور ضروری میٹنگ کرنی ہو گی اور اس حالت کو ان کے ذہن نشین کرانا ہو گا اور ساتھ ہی اس مسئلے کے حل کی تدبیر بھی بتانی ہو گی۔

مگر چمنی کے پاس یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا ہے، دیکھتے دیکھتے سارا آسمان غبارے کی طرح دھوئیں سے بھر گیا۔ سب نے خائف ہو کر ادھر دیکھا۔ کہیں آگ تو نہیں لگ گئی؟ آگ ہی معلوم ہوتی ہے۔

دفعتاً سامنے سڑک پر ہزاروں آدمی مل کی طرف دوڑے جاتے ہوئے۔ کھنا نے کھڑے ہو کر زور سے پوچھا "تم لوگ کہاں دوڑے

جا رہے ہو؟"

ایک آدمی نے رک کر کہا "اجی شکر مل میں آگ لگ گئی! آپ دیکھ نہیں رہے ہیں؟"

کھنا نے مہتا کی طرف دیکھا اور مہتا نے کھنا کی طرف۔ مالتی دوڑی ہوئی بنگلے میں گئی اور اپنے جوتے پہن آئی۔ افسوس اور شکایت کا موقع نہ تھا۔ کسی کے منہ سے ایک بات نہ نکلی۔ خطرے میں ہمارے ہوش و حواس کا رخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے۔ کھنا کا موٹر کھڑا ہی تھا۔ تینوں آدمی گھبرائے ہوئے آکر بیٹھے اور مل کی طرف بھاگے۔ چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ سارا شہر امڈا چلا آ رہا ہے۔ آگ میں آدمیوں کے کھینچنے کا جادو ہے۔ موٹر آگے نہ بڑھ سکا۔

مہتا نے پوچھا "آگ کا بیمہ تو کرا لیا تھا نا؟"

کھنا نے لمبا سانس کھینچ کر کہا "کہاں بھئی؟ ابھی تو لکھا پڑھی ہو رہی تھی۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے۔"

موٹر وہیں چھوڑ دیا گیا اور تینوں آدمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے مل کے سامنے جا پہنچے۔ دیکھا تو آگ کا ایک سمندر خلا میں امنڈ رہا تھا۔ آگ کی پاگل لہریں ایک ہو کر دانت پیستی تھیں اور زبانیں نکال رہی تھیں گویا آسمان کو بھی نگل جائیں گے۔ اس آگ کے سمندر کے نیچے ایسا دھواں چھایا ہوا تھا گویا ساون کی گھٹا کاجل میں نہا کر نیچے اتر آئی ہو۔ اس کے اوپر گویا آگ کا کانپتا اور اٹھتا ہوا پہاڑ کھڑا تھا۔ احاطہ میں لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ پولیس بھی تھی، فائر بریگیڈ بھی اور سیوا سمتی کے والنٹیر بھی، مگر سب کے سب آگ کی تیزی سے گویا شکست ہو گئے تھے۔ فائر بریگیڈ کے

چھینٹے اس آتشیں سمندر میں پڑ کر جیسے بجھ جاتے تھے۔ اینٹیں جل رہی تھیں آہنی گرڈر جل رہے تھے اور پگھلی ہوئی شکر کے پرنالے چاروں طرف جاری تھے اور تو اور زمین سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔

دور سے تو مہتا اور کھنّا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے لوگ کھڑے تماشا کیوں دیکھ رہے ہیں، آگ بجھانے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟ مگر اب انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ کرنا بس کے باہر ہے۔ مل کی دیوار سے پچاس گز کے اندر جانا جان جوکھم تھا۔ اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے تڑاق تڑاق ٹوٹتے ہوئے اچھل رہے تھے۔ کبھی ہوا کا رخ ادھر ہو جاتا تو بھگدڑ پڑ جاتی تھی۔

یہ تینوں بھیڑ کے پیچھے کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں آخر آگ لگی کیسے، اور اتنی جلد پھیل کیسے گئی؟ کیا پہلے کسی نے دیکھا نہیں یا دیکھ کر بھی بجھانے کی کوشش نہیں کی؟ ایسے ہی سوال سب ہی کے دل میں اٹھ رہے تھے مگر وہاں پوچھیں کس سے؟ مل میں کام کرنے والے ہوں گے تو ضرور مگر اس مجمع میں ان کا ملنا مشکل تھا۔

دفعتاً ہوا کا اتنا تیز جھونکا آیا کہ آگ کی لپٹیں نیچی ہو کر ادھر دوڑیں جیسے [illegible] جوار آگیا ہو۔ لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگے، ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے، گویا کوئی شیر جھپٹا آتا ہو۔ شعلوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی، جیسے حرکت آگئی تھی، جیسے ہزاروں پھن والے شیش ناگ سی جی اپنے منہ سے آگ اگل رہے تھے! کتنے ہی آدمی تو دھکے میں کچل گئے۔ کھنّا منہ کے بل گر پڑے۔ مالتی کو مہتا صاحب دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھے ورنہ وہ ضرور کچل گئی ہوتی۔ تینوں آدمی احاطہ کی دیوار کے پاس ایک

املی کے پیڑ کے نیچے آکر رکے۔ کھنا ایک طرح کی بیحس محویت کے ساتھ مل کی چمنی کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے۔

مہتا نے پوچھا: "آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

کھنا نے کوئی جواب نہ دیا، اسی طرف تاکتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں وہ بے حسی تھی جو جنون کی علامت ہے۔

مہتا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پھر پوچھا: "ہم لوگ یہاں بیکار کھڑے ہیں۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ آپ کے چوٹ زیادہ آگئی ہے آیئے لوٹ چلیں۔"

کھنا نے ان کی طرف دیکھا اور جیسے اپنی سنگ میں بولے: "جس کی یہ حرکت ہے انھیں میں خوب جانتا ہوں۔ اگر ان کو اسی میں اطمینان ملتا ہے تو ایشور ان کا بھلا کرے۔ مجھے کچھ پروا نہیں، کچھ پروا نہیں! آج چاہوں تو ایسی نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں۔ جی ہاں، بالکل نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں! یہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ مل نے مجھے نہیں بنایا، میں نے مل کو بنایا ہے، اور میں پھر بنا سکتا ہوں۔ مگر جن کی یہ حرکت نے انھیں میں خاک میں ملا دوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے رتی رتی معلوم ہے۔"

مہتا نے ان کا چہرہ اور ان کی حرکات کو دیکھا تو گھبرا کر بولے: "چلئے آپ کو گھر پہنچا دوں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

کھنا نے قہقہہ لگا کر کہا: "میری طبیعت اچھی نہیں ہے! اس لئے کہ یہ مل جل گئی۔ ایسی ملوں کو میں چٹکیوں میں کھو سکتا ہوں میرا نام کھنا ہے، چندر پرکاش کھنا! میں نے اپنا سب کچھ اس مل میں لگا دیا ہے پہلی مل میں ہم نے بیس فیصدی منافع دیا۔ میں نے حوصلہ پا کر یہ مل کھولا اس میں آدھے روپئے میرے ہیں۔ میں نے بینک کے دو لاکھ روپئے اس مل میں لگا دیئے۔ میں